حرفِ آغاز

مقاصدِ جہاد

سید جلال الدین عمری

جہاد کا حکم کس لیے ہے اور اسلامی ریاست کس مقصد کے لئے جہاد کرے گی؟ اس کا جاننا ضروری ہے۔ اسی سے جہاد اور دوسری جنگوں کا فرق واضح ہوگا، ورنہ اسے بھی دنیا کی دوسری جنگوں کی طرح کی ایک جنگ سمجھا جائے گا، جن کا مقصد دوسروں کو غلام بنانا اور اپنا اقتدار قائم کرنا ہوتا ہے۔ دنیا کی ظالم اور جابر قومیں اس قسم کی جنگیں کرتی رہی ہیں اور آج بھی کر رہی ہیں۔

جہاد فی سبیل اللہ

اسلام نے جس جنگ کا حکم دیا ہے اسے وہ مطلق جنگ یا قتال نہیں کہتا بلکہ جہاد فی سبیل اللہ کہتا ہے۔ اسے وہ ایمان کی صداقت کی دلیل قرار دیتا ہے۔ فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أُولٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُوْنَ ○ (الحجرات:-۱۵)	مومن تو بس وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، پھر شک میں نہیں پڑے اور اپنے اموال اور انفس کے ذریعے اللہ کے راستے میں جہاد کیا۔ یہی سچے (ایمان والے) ہیں۔

اس جنگ کو وہ 'قتال فی سبیل اللہ' بھی کہتا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ (البقرۃ:-۲۴۴)	اور اللہ کے راستے میں جنگ کرو اور جان لو کہ اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔

ایک جگہ اس کا حکم ان الفاظ میں آیا ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَایُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ○ (البقرۃ:-۱۹۰)	اور جنگ کرو اللہ کے راستے میں ان سے جو تم سے جنگ کر رہے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔

اعلاء کلمۃ اللہ

قتال فی سبیل اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ اس جنگ کو کہا جاتا ہے جو اپنے یا کسی اور کے ذاتی مفاد یا ایک کے ہاتھ سے زمامِ حکومت چھیننے اور دوسرے کو تختِ اقتدار پر فائز کرنے کے لئے نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کے کلمہ کی سربلندی کے لیے ہو۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری غرض اس میں شامل نہ ہو۔ اسے اعلاء کلمۃ اللہ بھی کہا گیا ہے۔ ابھی سورۂ بقرہ کی (آیت ۱۹۰) کا حوالہ گزر چکا ہے۔ اس کے تحت علامہ زمخشری نے قتال فی سبیل اللہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

المقاتلة فی سبیل الله هو الجهاد لإعلاء کلمة الله و لإعزاز الدین [۱]	قتال فی سبیل اللہ اس جہاد کو کہا جاتا ہے جو اللہ کے کلمہ کی سربلندی اور دین کے اعزاز کے لئے ہو۔

اسی آیت کے ذیل میں قاضی بیضاوی کے الفاظ ہیں:

جاهدوا لإعلاء کلمة الله و إعزاز دینه [۲]	جہاد کرو اللہ کے کلمہ کی سربلندی اور اس کے دین کی عزت و وقار کے لئے۔

---

[۱] الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/۲۳۳۔ دار الکتب العلمیہ، لبنان، ۱۹۹۵

[۲] بیضاوی (تفسیر)، انوار التنزیل و اسرار التاویل: ۱/۱۰۸، دار الکتب العلمیہ، لبنان، ۱۹۸۸ء

اس جنگ میں جو اخلاص مطلوب ہے، امام رازی اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

قاتلوا فی سبیل الله فی طاعته وطلب رضوانه۔[1]	جنگ کرو، اللہ کے راستے میں یعنی اس کی اطاعت وفرماں برداری اور اس کی خوشنودی کی طلب میں۔

حکم ہے جہاد یا قتال فی سبیل اللہ کا، یعنی یہ جنگ اللہ کے راستے میں ہو۔ اللہ کے راستے سے مراد اس کا دین اور شریعت ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر انسان دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ علامہ ابو حیان اندلسی نے جہاد کا مقصد اور فی سبیل اللہ کی معنویت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

والظاهر ان المقاتلة فی سبیل الله هی الجهاد فی الكفار لإظهار دین الله و إعلاء كلمته ۔۔۔ السبیل هو الطریق و استعیر لدین الله و شرائعه فإن المتبع ذالك یصل إلی بغیته الدینیة و الدنیویة فشبّه بالطریق الموصل الإنسان إلی مایقصده۔[2]	قتال فی سبیل اللہ سے، بظاہر کفار اور منکرین سے جہاد مراد ہے جو اظہارِ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ہو۔۔۔ سبیل کے معنی راستے کے ہیں۔ یہاں یہ لفظ اللہ کے دین اور اس کی شریعت کے لئے بطورِ استعارہ آیا ہے۔ اس لئے کہ اس راستہ پر چلنے والا اپنے دینی اور دنیوی مقصد تک پہنچتا ہے۔ اس لئے اسے اس راستے سے تشبیہ دی گئی ہے جو انسان کے مقصد تک اس کی رسائی کا ذریعہ ہے۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں:

---

[1] رازی، التفسیر الکبیر، ج ۳، جزء ۵ ص ۱۰۹، دار الکتب العلمیہ، لبنان، ۱۹۹۰ء

[2] ابوحیان، البحر المحیط: ۲/۲۷۳۔ دار الکتب العلمیہ، لبنان، ۱۹۹۳ء

أی جاهد والإعزاز دین الله تعالیٰ وإعلاء کلمته، فالسبیل بمعنی الطریق مستعار لدین الله تعالیٰ و کلمته لانه یتوصل المومن به إلی مرضاته سبحانه تعالیٰ [1]

یعنی جہاد کرو، اللہ تعالیٰ کے دین کے اعزاز اور اس کے کلمے کو بلند کرنے کے لئے۔ لفظ سبیل، راستے کے معنی میں ہے جو اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کے کلمے کے لئے استعمال ہوا ہے اس لئے کہ اسی کے ذریعے مومن اللہ تعالیٰ کی مرضیات تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

قرآن مجید کے الفاظ اور اہلِ علم کی تشریحات سے واضح ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ اس جنگ کا نام ہے جو اللہ کے دین اور اس کی شریعت کی سربلندی کے لیے ہو، اِسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جس کا مقصد دین اور شریعت کا نفاذ ہو۔ جہاد کے اس نصب العین نے، خاندانی، قبائلی، نسلی اور وطنی جنگوں کو غلط اور باطل قرار دیا ہے۔ اس کی رُو سے ہر وہ جنگ جو اس پاکیزہ نصب العین کے لیے نہ ہو، کفر کی جنگ اور 'فی سبیل الطاغوت' ہے۔ اِس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ۔ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا۝ (النساء:۷۶)

وہ لوگ جو ایمان والے ہیں اللہ کے راستے میں جنگ کرتے ہیں اور جنہوں نے کفر کیا وہ 'طاغوت' کے راستے میں لڑتے ہیں تو تم شیطان کے حمایتیوں سے جنگ کرو۔ بے شک شیطان کی تدبیر کم زور ہے۔

جہاد جس پاک جذبہ اور پاک مقصد کے تحت ہونا چاہئے، اسے احادیث میں اچھی طرح واضح کردیا گیا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے کہ ایک اعرابی نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر

---

[1] آلوسی، روح المعانی: ۲/۴۷۰۔ دار الکتب العلمیہ، لبنان، ۱۹۹۴ء

ہوکر سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلم (قتال فی سبیل اللہ کیا ہے؟ اس لیے کہ) ایک شخص غنیمت کی خاطر جنگ کرتا ہے، ایک شخص ریا کاری کے جذبے سے لڑتا ہے۔ اس لیے لڑتا ہے کہ اس کا ذکر اور چرچا ہو۔ ایک شخص اس لیے لڑتا ہے کہ اس کی پامردی اور ثابت قدمی لوگ دیکھ سکیں۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص اپنا غصہ نکالنے کے لیے لڑتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص قومی یا قبائلی حمیت کے تحت لڑتا ہے۔ ان میں سے کس شخص کی جنگ کو فی سبیل اللہ کہا جائے گا؟ آپ نے اُن میں سے ایک ایک بات کا جواب دینے کی جگہ مقصدِ جہاد کو چند جامع کلمات میں بیان فرمادیا:

من قاتل لتكون كلمة الله هى العليا فهو فى سبيل الله۔[1]

جس کسی نے صرف اس لئے جنگ کی کہ اس سے اللہ کا کلمہ بلند ہو تو اس کی جنگ فی سبیل اللہ (یعنی اللہ کے راستے میں) ہوگی۔

امام نوویؒ اس کے ذیل میں لکھتے ہیں:

إن الفضل الذى ورد فى المجاهدين فى سبيل الله يختصّ بمن قاتل لتكون كلمة الله هى العليا [2]

مجاہدین فی سبیل اللہ کی فضیلت جو احادیث میں آئی ہیں وہ ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو صرف اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لئے جنگ کریں۔

---

[1] بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا۔ مسلم: کتاب الامارۃ، باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔ نیز ملاحظہ ہو۔ ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابواب الجہاد۔

[2] شرح مسلم: ج ۷ جزء ۱۳، ص ۴۳۔ دار الکتب العلمیہ، لبنان ۱۹۹۵ء۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: بقیہ اگلے صفحہ پر

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ضمانت لیتا ہے اور اپنے اوپر واجب قرار دیتا ہے کہ جو شخص اس کے راستے میں نکلے، اس کے پیش نظر صرف اس کے راستے میں جہاد ہو، وہ اس پر ایمان رکھتا اور اس کے رسولوں کی تصدیق کرتا ہو تو وہ اسے جنت میں داخل کرے گا یا اسے اس کے گھر لوٹائے گا اس اجر و ثواب اور غنیمت کے ساتھ جو اُسے ملا ہے [1]

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آدمی جہاد فی سبیل اللہ کا ارادہ کرتا ہے لیکن وہ دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز چاہتا ہے۔ (کیا وہ مستحق اجر ہے؟) آپؐ نے فرمایا: 'لا أجر لہٗ' اس کے لیے کوئی اجر نہیں ہے۔ لوگوں نے خیال کیا کہ یہ تو بہت دشوار امر ہے۔ اس شخص سے کہا کہ تم شائد اپنی بات سمجھا نہ سکے، اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دوبارہ پیش کرو۔ اس نے اپنی بات دوبارہ کہی کہ اے اللہ کے رسول! آدمی جہاد کرتا ہے اور دنیا کے ساز و سامان میں سے کوئی چیز چاہتا ہے؟ آپ نے فرمایا: 'لا أجر لہٗ' اسے کوئی اجر نہیں ملے گا۔ لوگوں کے کہنے پر اس شخص نے تیسری بار یہی سوال کیا تو آپ نے یہی جواب دیا کہ اس کے لیے کوئی اجر نہیں ہے [2]

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا) کہ جہاد کا حقیقی اور اصل محرک تو اعلاء کلمۃ اللہ ہی ہونا چاہئے، ہاں اگر ضمناً دوسری چیزیں حاصل ہو جائیں تو اس سے ثواب میں فرق واقع نہ ہوگا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ (فتح الباری: ۶/۱۰۹-۱۱۰)

[1] بخاری، کتاب الایمان، باب الجہاد من الایمان۔ مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الجہاد والخروج فی سبیل اللہ۔

[2] ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی من یغزو ویلتمس الدنیا۔

وسلم نے فرمایا: غزوات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ جو شخص اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہے، امام کی اطاعت کرے، اپنی بہترین چیز (جان اور مال) خرچ کرے، اپنے ہم سفر کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے اور فساد سے بچا رہے تو اس کے سونے اور جاگنے ہر چیز کا ثواب ہے۔ لیکن جس شخص کی جنگ فخر، ریا کاری اور شہرت کے لیے ہو، وہ امام کی نافرمانی کرے اور زمین میں فساد مچائے تو وہ برابری کے ساتھ بھی نہیں لوٹے گا، (جس حالت میں گیا تھا اس سے بُرے حال میں واپس ہوگا)۔[۱]

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے جہاد اور غزوے (کی فضیلت بتایئے) آپ نے ارشاد فرمایا: اے عبداللہ بن عمروؓ! اگر تم نے جہاد میں صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا، ثواب کی خاطر اس میں شرکت کی تو اللہ تعالیٰ تمہیں صابر اور محتسب (طالبِ ثواب) کی حیثیت سے اُٹھائے گا۔ لیکن اگر تم نے ریا کاری کے لیے یا مال و دولت بڑھانے کے لیے جنگ کی تو اللہ تعالیٰ ریا کار اور طالبِ مال کی حیثیت سے اُٹھائے گا۔ اے عبداللہ بن عمرو! جس جذبہ اور کیفیت کے ساتھ تم نے جنگ کی اور مارے گئے اللہ تعالیٰ اُسی جذبہ اور کیفیت کے ساتھ تمہیں اُٹھائے گا۔[۲]

حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے جنگ کی اور اس کی نیت صرف ایک چھوٹی سی رسّی کی تھی تو اُسے وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔[۳]

---

۱ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی من یغزو ویلتمس الدنیا۔ نسائی: کتاب الجہاد، باب فضل الصدقۃ فی سبیل اللہ۔

۲ ابوداؤد: کتاب الجہاد، باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا۔

۳ نسائی: کتاب الجہاد، باب من غزا فی سبیل اللہ ولم ینو من غزاتہ إلاّ عقالاً۔ مسند احمد: ۶/۴۳۰، ۴۳۷، ۴۵۱۔ دار احیاء التراث العربی۔ بیروت لبنان ۱۹۹۴ء

یہ ہے وہ اعلیٰ مقصد جس کے لیے جہاد کیا جاتا ہے اور اِن پاکیزہ جذبات کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

فتنہ نہ رہے

جہاد کا ایک مقصد فتنے کا مقابلہ کرنا اور اسے ختم کرنا ہے۔ یہ مقصد قریش اور اہلِ مکہ سے جنگ کے حکم کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔ ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا إِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ o وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَأَخْرِجُوْهُمْ مِنْ حَیْثُ أَخْرَجُوْكُمْ وَ الْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰی یُقَاتِلُوْكُمْ فِیْهِ فَإِنْ قَاتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِیْنَ o فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ o وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ یَكُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ o اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ وَ اتَّقُوْا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا

اور جنگ کرو اللہ کے راستے میں ان سے جو تم سے جنگ کر رہے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ انہیں قتل کرو جہاں پاؤ۔ اور انہیں نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا اور فتنہ قتل سے زیادہ شدید ہے۔ مسجد حرام کے پاس ان سے جنگ نہ کرو جب تک کہ وہ اس میں تم سے جنگ نہ کریں۔ پس اگر وہ تمہیں قتل کرنے کے لیے بڑھیں تو تم انہیں قتل کرو۔ کافروں کا یہی بدلہ ہے۔ لیکن اگر وہ جنگ سے باز آجائیں تو اللہ بخشنے اور رحم کرنے والا ہے۔ اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے۔ وہ اگر اس سے رک جائیں تو ظالموں کے سوا

أَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ٥
(البقرۃ:۱۹۰-۱۹۴)

کسی پر زیادتی نہ ہوگی۔حرمت کا مہینہ (اس میں اگر تمہیں جنگ کرنی پڑے تو) اس حرمت کے مہینے کا بدلہ ہے(جس میں اس سے پہلے مشرکین نے تمہارے ساتھ زیادتی کی تھی) حرمتیں تو سب کے لئے برابر ہیں۔لہٰذا جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو اس کا اتنا جواب دو جتنی اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

ان آیات میں جنگ کا حکم بھی ہے اور اس کا پس منظر بھی بیان ہوا ہے کہ مشرکینِ قریش نے مسلمانوں کو مکہ چھوڑنے، گھر سے بے گھر ہونے اور ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔حرم میں انہیں داخل ہونے اور خانۂ کعبہ میں اللہ کی عبادت سے روکا۔ بعد میں مستقل حالتِ جنگ قائم کر دی اور عملاً جنگ کرتے رہے۔مسلمانوں کو ان کے مقابلے میں جنگ کا حکم دیا گیا اور اس کا مقصد یہ بتایا گیا کہ آئندہ یہ صورتِ حال باقی نہ رہے اور دشمن کی قوت پوری طرح ختم کر دی جائے۔اس سلسلے میں ہدایت کی گئی کہ ان مشرکین سے حدودِ حرم میں جنگ سے احتراز کیا جائے۔لیکن اگر وہ اس کی پاس داری نہ کریں اور تلوار اُٹھائیں تو ان کا مقابلہ کیا جائے۔اگر وہ حرم کا احترام کریں اور جنگ سے باز آجائیں تو ان سے ہاتھ روک لیا جائے۔ یہ بات اسی پسِ منظر کے ساتھ اسی سورہ میں آگے بیان ہوئی ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَ صَدٌّ

وہ تم سے حرام مہینے میں قتال کے متعلق پوچھتے ہیں۔کہو کہ اس میں قتال کرنا بڑا

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ إِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوْا وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ أُولٰئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ ○ (البقرۃ:۲۱۷)

گناہ ہے، لیکن اللہ کے راستے سے روکنا، اس کے ساتھ کفر کرنا، مسجد حرام کی زیارت سے روکنا اور اس کے رہنے والوں کو وہاں سے نکال دینا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے اور فتنہ، قتل سے بہت بڑا (جرم) ہے۔ وہ تم سے ہمیشہ لڑتے رہیں گے، یہاں تک کہ اگر ان سے ہو سکے تو تمہیں تمہارے دین ہی سے پھیر دیں۔ لیکن تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے اور اس کی موت اس حال میں آئے کہ وہ کافر ہے تو اس کے اعمال دنیا اور آخرت میں رائگاں جائیں گے، یہ لوگ جہنم والے ہیں۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

مفسرین کا اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ سورۂ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت **وَقَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ الآية.** (۱۹۰) میں پہلی بار مشرکین سے جنگ کا حکم دیا گیا۔ علامہ ابوحیان اندلسی کہتے ہیں۔

و أكثر علماء التفسير على أنها أول أية نزلت فى الأمر بالقتال [1]

بیشتر علماء تفسیر کا خیال ہے کہ یہ پہلی آیت ہے جو قتال کے حکم کے ساتھ نازل ہوئی۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس آیت میں ان لوگوں سے جنگ کا حکم دیا

---

[1] ابوحیان، البحر المحیط: ۲/۲ ۷ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ..... بقیہ اگلے صفحہ پر

گیا جو عملاً جنگ کر رہے ہیں۔ اور جو جنگ میں شریک نہ ہوں ان کے خلاف اقدام کی اجازت نہیں دی گئی، لیکن بعد کی آیات یا سورۂ توبہ کی آیت ۵ میں تمام مشرکینِ قریش سے جنگ کا حکم دیا گیا، چاہے وہ جنگ کر رہے ہوں یا نہ کر رہے ہوں۔ اس طرح یہ حکم منسوخ ہو گیا۔[1]

یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ آیات ایک ہی سلسلۂ کلام میں آئی ہیں اور یہ بات کچھ عجیب سی ہوگی کہ پہلی آیت کے حکم کو دوسری آیت منسوخ کر دے۔ امام رازی فرماتے ہیں۔ اسے منسوخ ماننے کی ضرورت ہی نہیں ہے، اس لیے کہ پہلی آیت میں وَلَا تَعْتَدُوا (اور تم زیادتی نہ کرو) کے الفاظ آئے ہیں۔ اس میں وہ امور بھی داخل ہیں جن کا ذکر بعد کی آیات میں آیا ہے۔ یعنی حدودِ حرم میں ان سے جنگ نہ کی جائے اور ان تمام باتوں سے احتراز کیا جائے جن کی حالتِ جنگ میں ممانعت ہے۔[2]

(باقی پچھلے صفحہ کا) سے مروی ہے کہ جنگ کے سلسلے میں سب سے پہلے سورۂ حج کی آیت أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا (الحج:۳۹) نازل ہوئی۔ لیکن امام قرطبی کہتے ہیں کہ اکثر لوگوں کی یہی رائے ہے کہ جہاد کا حکم سورۂ بقرہ کی ان ہی آیات میں دیا گیا (قرطبی: ج۱، جزء۲ص۱۳۲، دار الکتب العلمیہ، ۱۹۸۸) بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ سورۂ حج کی آیت میں جنگ کی اجازت دی گئی اور سورۂ بقرہ کی ان آیات میں برسرِ پیکار مشرکین سے جنگ کا حکم دیا گیا۔

۱ جلالین میں ہے: هذا منسوخ بآية براءة أو بقوله وَاقْتُلُوهُمْ، الآية۔ یہی بات بعض اور مفسرین نے بھی کہی ہے۔ اس میں سورۂ توبہ کی جس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ یہ ہے۔ فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ الآية یعنی جب محترم مہینے نکل جائیں تو مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ اس کے پس منظر سے انشاء اللہ آئندہ بحث ہوگی۔

۲ رازی، التفسیر الکبیر: ج۳ جزء۵ص۱۰۹-۱۱۰۔

علامہ ابوحیان اندلسی بھی اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ پہلی آیت میں جو حکم دیا گیا ہے دوسری آیت میں اس سے آگے کا حکم ہے۔ فرماتے ہیں: بعد کی آیات میں وَاقْتُلُوهُمْ (اور انہیں قتل کرو) سے مراد وہی لوگ ہیں جن سے پہلی آیت میں جنگ کا حکم دیا گیا ہے۔ [۱]

علامہ شیخ محمد عبدہ نے اس رائے پر سخت تنقید کی ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے کی منسوخ ہیں اور کہا ہے کہ یہ آیات باہم مربوط ہیں۔ انہیں اس طرح تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

إن هذه الآيات نزلت مرة واحدة في نسق واحد وقصة واحدة فلا معنى لكون بعضها ناسخاً للآخر۔ [۲]

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آیات ایک ہی مرتبہ نازل ہوئیں۔ وہ ایک ہی سلسلۂ کلام اور ترتیب میں واقع ہوئی ہیں اور ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں، لہٰذا اس کے کوئی معنی نہیں کہ ان میں سے بعض آیتیں بعض کی ناسخ ہو جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آیات کے اس مجموعے میں جنگ کے حکم سے پہلے اس کے اصول و آداب بیان ہوئے ہیں کہ جنگ ان ہی سے ہوگی جو میدانِ جنگ میں مقابلے کے لیے آئیں۔ عام شہری آبادی کو جو جنگ سے عملاً دور ہے نشانہ نہیں بنایا جائے گا اور ان افراد پر بھی ہاتھ نہیں اُٹھایا جائے گا جو جنگ سے غیر متعلق ہیں۔ [۳]

ان آیات میں جنگ کے جواز کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ

---

۱ ابوحیان، البحر المحیط: ۲/۳۷۰۔

۲ تفسیر القرآن الحکیم، المنار: ۲/۲۱۰، دار المعرفۃ، لبنان ۱۹۹۳۔

۳ جنگ میں جن لوگوں پر ہاتھ اُٹھانے کی ممانعت ہے حدیث..... بقیہ اگلے صفحہ پر

مِنَ الْقَتْلِ ، (فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے) فتنے کے معنی ہیں سونے چاندی کو آگ میں تپانا۔ اسی سے کسی انسان کو سخت تکلیف اور اذیت دینے، ابتلاء اور آزمائش میں ڈالنے کا تصور ابھرا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں۔

أصل الفتن ادخال الذهب النار لتظهر جودته من ردائته، واستعمل فى ادخال الإنسان النار ١

'فتن' کے اصل معنی ہیں سونے کو آگ میں ڈالنا تاکہ خالص سونا کھوٹے سے نمایاں ہو جائے اور اس کا استعمال انسان کو آگ میں ڈالنے کے معنی میں (بھی) ہونے لگا۔

لسان العرب میں ازھری وغیرہ کے حوالے سے لکھا ہے۔

جماع معنى الفتنة الابتلاء والإمتحان والإختبار، و أصلها ماخوذ من قولك 'فتنتُ الفضة والذهبَ' إذا أذبتهما بالنار لتميز الردئ من الجيّد ٢

فتنہ کے معنی کا خلاصہ ہے ابتلاء، امتحان اور آزمائش۔ اس کی اصل اس استعمال سے ماخوذ ہے جو آپ کہتے ہیں 'فتنتُ الفضۃ والذھبَ' جب آپ چاندی اور سونے کو آگ میں پگھلائیں تاکہ عمدہ اور ردّی الگ ہو جائے۔

(باقی پچھلے صفحہ کا) میں ان کی تفصیلات موجود ہیں، ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق''۔ عنوان 'جنگ کے آداب' ص ۲۱۲ تا ۲۱۶ طبع دوم ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ۔ علامہ ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط: ۷/۳ میں اس پر مختصر سی بحث کی ہے اور علامہ قرطبی نے اس مسئلہ میں فقہاء کے خیالات کی بھی کسی قدر وضاحت کی ہے۔ ملاحظہ ہو الجامع لاحکام القرآن، جلد ا جزء ۲، ص ۲۳۲-۲۳۳

١ مفردات ص ۳۷۴۔

٢ ابن منظور۔ لسان العرب۔ مادہ فتن۔ ۱۳/۳۱۷۔ دار صادر لبنان ۱۹۹۴ء۔

امام رازی کہتے ہیں۔

إن الفتنة أصلها عرض الذهب على النار لاستخلاصه من الغشّ ثم صار إسماً لكل ما كان سببا للإمتحان تشبيها بهذا الأصل۔ [۱]

'فتنہ' کی اصل ہے سونے کو آگ میں ڈالنا تاکہ اسے میل کچیل سے پاک کیا جائے۔ پھر اس اصل سے مشابہت اختیار کرتے ہوئے یہ ہر اس چیز کا نام ہوگیا جو امتحان اور آزمائش کا سبب بن جائے۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ فتنہ کے معنی دراصل کسی کو سخت آزمائش میں ڈالنے اور تکلیف اور اذیت سے دوچار کرنے کے ہیں۔ اسی کو یہاں قتل سے شدید تر کہا گیا ہے۔ چنانچہ زمخشری 'والفتنة أشد من القتل' کے ذیل میں کہتے ہیں۔

أی المحنة و البلاء الذی ينزل للإنسان يتعذب به أشد عليه من القتل [۲]

وہ محنت اور مصیبت جو انسان پر نازل ہو جس سے وہ عذاب میں مبتلا ہو جائے، قتل سے بھی شدید تر ہے۔

بیضاوی میں آیت کے اس فقرے کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

أی المحنة التی يفتتن بها الإنسان كالإخراج من الوطن أصعب من القتل لدوام تعبها و تألّم النفس فيه۔ [۳]

وہ محنت اور تکلیف جس سے انسان آزمایا جائے جیسے وطن سے نکال باہر کر دینا، قتل سے بھی زیادہ سخت ہے، اس لئے کہ اس کی تکلیف دائمی ہوتی ہے اور نفس اس سے مستقل درد محسوس

---

[۱] رازی، التفسیر الکبیر: جلد ۳؛ جزء ۵ ص ۱۱۱۔ نیز ملاحظہ ہو رشید رضا، تفسیر المنار: ۲/۲۰۹

[۲] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/۲۳۴

[۳] بیضاوی، تفسیر: ۱/۱۰۹

کرتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہاں فتنے کے کیا معنی ہیں؟ اس کے بہت سے معنی بیان ہوئے ہیں۔ [۱]

لیکن ان سب کا خلاصہ دو نکات میں بیان ہوسکتا ہے۔

۱۔ یہاں فتنے سے مراد قریش یا اہلِ مکہ کا کفر و شرک ہے۔ اس پر اگر وہ جمے ہوئے ہیں اور حدودِ حرم میں بھی اس کا ارتکاب کر رہے ہیں تو یہ اتنا بڑا جُرم ہے کہ اس کے نتیجے میں ان سے جنگ کی جائے اور وہ مارے جائیں، یا یہ کہ اس میں مسلمان شہید ہوں تو یہ غلط نہیں ہوگا۔ اس کا جواز خود انہوں نے فراہم کر دیا ہے۔ [۲]

۲۔ یہاں فتنے سے مراد وہ غلط رویہ ہے جو مشرکین نے اہلِ ایمان کے ساتھ اختیار کر رکھا تھا۔ انہوں نے مذہب اور عقیدے کی آزادی ان سے سلب کر لی اور اسلام جو اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دینِ حق ہے اس کے ماننے پر انہیں سخت تعذیب میں مبتلا کیا اور ہر نوع کی سزا کا انہیں مستحق گردانا۔ اسی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ رویہ قتل سے زیادہ شدید ہے۔ اس بات کو امام رازی نے اس طرح بیان کیا ہے۔

والمعنى: أن إقدام الكفار	اس کے معنی یہ ہیں کہ کفار کا کفر
على الكفر وعلى تخويف	پر اقدام اور اہل ایمان کو حالتِ
المؤمنين وعلى تشديد	خوف میں مبتلا رکھنا اور ان کے
الأمر عليهم بحيث صاروا	ساتھ سخت رویہ اختیار کرنا، جس کے
ملجئين إلى ترك الأهل و الوطن	نتیجے میں وہ دین کے معاملے
هرباً من إضلالهم في الدين و	میں ان کی گمراہ کن کوششوں سے
تخليصاً للنفس مما	بھاگنے اور خود کو ان کے خوف سے

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ ابوحیان، البحر المحیط: ۲/۴۷

[۲] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۲/۲۳۴

یخافون و یحذرون فتنة شدیدة بل هی أشد من القتل الذی یقتضی التخلیص من غموم الدنیا و آفاتها۔[۱]

بچانے کے لئے اپنے اہل وعیال اور وطن کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں، یہ شدید فتنہ ہے بلکہ یہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے جس کے بعد انسان دنیا کے غموں اور آفات سے نجات پا جاتا ہے۔

یہی مفہوم سباق وسیاق کے لحاظ سے صحیح ہے۔ عقیدہ اور اس کے مطابق عمل کی آزادی انسان کا فطری حق ہے۔ اس پر پابندی لگانا بہت بڑا جرم اور انتہائی غلط رویہ ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ قریش نے یہی رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ اسی کو یہاں 'فتنہ' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ کسی بھی شخص کے حق میں قتل سے زیادہ سخت ہے اور یہ جنگ اسی کو ختم کرنے کے لیے تھی۔ علامہ قرطبی کہتے ہیں۔

الفتنة أشدّ من القتل، أی الفتنة التی حملوهم علیها و راموا رجوعکم بها إلی الکفر أشد من القتل۔

فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے۔ یعنی وہ فتنہ جس میں انہوں نے مسلمانوں کو ڈال رکھا تھا اور جس کے ذریعہ وہ یہ چاہ رہے تھے کہ مسلمان کفر کی طرف لوٹ جائیں قتل سے زیادہ سخت ہے۔

پھر اس کے بعد حضرت مجاہدؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

أی من أن یقتل مومن فالقتل أخفّ علیهم من الفتنة [۲]

یعنی یہ کہ فتنہ شدید ہے اس بات سے کہ مومن قتل کر دیا جائے اس لیے کہ فتنہ کے مقابلہ میں قتل اس کے لیے ہلکا ہے۔

---

۱ رازی، التفسیر الکبیر: ج ۳، جزء ۵ ص ۱۱۱

۲ قرطبی، الجامع لأحکام القرآن: جلد ۱، جزء ۲ ص ۲۳۴

یہ درحقیقت اسی فتنے کو ختم کرنے کا حکم ہے جس سے اہلِ ایمان دوچار تھے اور اپنے عقیدہ اور فکر کی وجہ سے طرح طرح کی ابتلا اور آزمائش سے گزر رہے تھے۔ قرآن نے اس اعلان کے ساتھ یہ جنگ شروع کی کہ جب تک یہ صورتِ حال ختم نہ ہو اور اسلام کو قبول کرنے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی حاصل نہ ہو، یہ جنگ جاری رہے گی۔

ان آیات کے آخر میں کہا گیا۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَاتَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۝	اور جنگ کرو ان سے، یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین اللہ کیلئے ہو جائے۔

یہ آیت سورۂ انفال میں ایک لفظ کے اضافے کے ساتھ آئی ہے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَاتَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۝ (الانفال: ۳۹)	اور ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔

یہاں فتنہ سے عام طور پر شرک مراد لیا گیا ہے۔ یعنی یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھو جب تک کہ شرک کا فتنہ بالکل ختم نہ ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لیے نہ ہو جائے۔ لیکن علماء کا اتفاق ہے کہ یہ معاملہ صرف مشرکینِ عرب کے ساتھ ہوگا۔ غیر عرب مشرکین اور دوسرے مذاہب کے ماننے والے اس حکم میں شامل نہیں ہیں۔ ان کے احکام دوسرے ہیں۔ علامہ ابوبکر جصاص حنفی لکھتے ہیں۔

''آیت میں مشرکینِ مکہ کا حال بیان ہوا ہے، جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو مکہ سے نکالا تھا۔ ان کے بارے میں کہا گیا۔ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ (انہیں جہاں پاؤ قتل کرو) اس حکم میں اہل کتاب داخل نہیں ہیں۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ مشرکین عرب کے لیے دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو وہ اسلام قبول کریں یا جنگ کے لیے تیار ہو جائیں''[1]

---

[1] جصاص، احکام القرآن: ۱/۳۱۶

اس موضوع پر تفصیلی بحث الگ سے آئے گی۔انشاءاللہ۔

مستضعفین کی مدد

اگر کسی غیر اسلامی ریاست میں مسلمان عقیدے اور عمل کی آزادی سے محروم ہیں، اللہ کے دین پر عمل کی وجہ سے انہیں سخت اذیت اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور حالات اتنے خراب اور دشوار ہیں کہ وہاں سے وہ ہجرت کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے تو اس صورت میں قرآن مجید نے اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری قرار دی ہے کہ وہ انہیں ان حالات سے نکالنے کی کوشش کرے۔اس کے لئے اسے طاقت بھی استعمال کرنی پڑے تو اس سے دریغ نہ کرے۔مکہ میں مسلمان اسی طرح کی صورت حال سے دوچار تھے۔قرآن مجید نے ان کے لئے 'مستضعفین' کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی وہ جو قوت اور طاقت سے محروم اور مغلوب ہیں اور جنہیں کم زور کر کے اور دبا کر رکھا گیا ہے۔ان کے متعلق حکم ہوا۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ۝ (النساء:۷۵)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جنگ نہیں کرتے ہو اللہ کے راستے میں اور مستضعفین کے لئے جن میں مرد، عورتیں اور بچے شامل ہیں، جو دعائیں کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنے پاس سے ہمارے لئے کوئی ولی و سرپرست پیدا فرما دے اور ہمارے لئے اپنے پاس سے کوئی مددگار فراہم کر دے۔

اس آیت میں 'قتال فی سبیل اللہ' کے عام حکم کے ساتھ خاص طور پر

'مستضعفین' کا ذکر ہے اس سے ان کو نجات دلانے کے لیے جہاد کی اہمیت واضح ہو رہی ہے۔ علامہ زمخشری کہتے ہیں:

''یہ وہ مستضعفین (کم زور اور مغلوب افراد) تھے جو مکہ میں اسلام لائے اور جنہیں مشرکین ہجرت کرنے نہیں دے رہے تھے۔ وہ وہیں دبے اور پسے ہوئے اور کم زور بن کر رہنے پر مجبور تھے۔ مشرکین کی طرف سے ان کو سخت تکلیفیں دی جا رہی تھیں اور وہ ان سے نجات پانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں اور اس سے نصرت کی طلب اور التجا کر رہے تھے۔ چنانچہ اللہ نے ان میں سے بعض کے لیے مدینہ ہجرت کرنا آسان کر دیا اور بعض فتح مکہ تک اذیتیں جھیلتے رہے۔ فتح مکہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے بہترین ولی و ناصر بن کر آئے۔ آپ جب مکہ سے واپس ہوئے تو عتاب بن اُسید کو گورنر مقرر کیا۔ انہوں نے آپ کے سچے جانشین کی حیثیت سے ان کی نصرت اور حمایت جاری رکھی اور انہیں ان کے حقوق دلوائے۔[1]

علامہ قرطبی اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

حضّ علی الجهاد و هو يتضمّن تخليص المستضعفين من أيدى الكفره المشركين الذين يسومونهم سوء العذاب ويفتنونهم عن الدين، وأوجب تعالىٰ الجهاد لإعلاء كلمته و إظهار دينه واستنقاذ المؤمنين الضعفاء	یہ جہاد کی ترغیب ہے۔ اس میں ان مستضعفین کو کفار و مشرکین کے پنجۂ ظلم سے چھڑانا بھی شامل ہے جو انہیں بدترین سزا دے رہے تھے اور انہیں دین سے پھیرنے کے لئے فتنے (طرح طرح کی آزمائش) میں ڈال رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد کو فرض کیا ہے اپنے کلمے کی سربلندی، اپنے دین کے غلبے اور اپنے بندوں میں سے ضعیف مومنوں

[1] زمخشری: الکشاف: ۱/۵۲۳

من عباده و إن كان فی ذلك تلف النفوس [1]

کو (دشمنوں کے چنگل سے) نکالنے کے لیے۔ چاہے اس میں جانوں کی ہلاکت ہی کیوں نہ ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں مسلمان آزادئ عقیدہ وعمل کے بنیادی حق سے محروم ہیں اور ظلم اور ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں اور وہاں سے نکلنے اور ہجرت کرنے کے موقف میں بھی نہیں ہیں تو اسلامی ریاست اس سلسلے میں غیر جانب دار اور غیر متعلق ہو کر نہیں رہے گی، بلکہ ان مظلوموں کو اس ظلم سے نکالنے کی کوشش کرے گی اس کے لیے وہ وقتِ ضرورت طاقت بھی استعمال کر سکتی ہے۔ لیکن اگر کسی غیر اسلامی ریاست کے ساتھ نا جنگ معاہدہ ہو تو اسلامی ریاست کے لئے لازم ہوگا کہ اس کا احترام کرے اور اس کے خلاف فوجی اقدام سے احتراز کرے۔ قرآن مجید نے صراحت کی ہے کہ جن اہل ایمان نے مدینہ ہجرت نہیں کی اور وہ دار الکفر ہی میں مقیم ہیں اگر ان پر ظلم وزیادتی ہو رہی ہے اور وہ اس کے خلاف تم سے مدد طلب کر رہے ہیں تو تمہیں لازماً ان کی مدد کرنی چاہئے لیکن اگر وہ تم سے کسی ایسی قوم کے مقابلے میں مدد کے طالب ہیں جس سے تمہارا معاہدۂ امن ہے تو ان کی حمایت میں معاہدہ کی خلاف ورزی کا تمہیں حق نہیں ہے۔ ورنہ یہ سنگین غلطی ہوگی اور اس پر اللہ کے ہاں باز پرس ہوگی۔ ارشاد ہے۔

وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ (الانفال:۷۲)

اگر وہ تم سے دین کے معاملے میں مدد طلب کریں تو تمہارے لئے مدد کرنا ضروری ہے، البتہ اس قوم کے خلاف نہیں جس کے اور تمہارے درمیان عہد وپیمان ہو (امن کا) اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو دیکھ رہا ہے۔

---

[1] قرطبی: الجامع لأحکام القرآن: ج ۳ جزء ۵ ص ۱۸۰

مفسرین نے صراحت کی ہے کہ 'دارالحرب' سے معاہدۂ امن ہو تو وہاں کے مسلمانوں کی مدد کے لئے معاہدہ ختم نہیں کیا جائے گا۔ معاہدہ ختم کرنے کی وجوہ کچھ دوسری ہو سکتی ہیں جیسے وہ معاہدہ کی خلاف ورزی یا اسلامی ریاست کے خلاف سازش کا ارتکاب کریں یا ریاست پر حملہ آور ہوں۔ بہر حال جب تک معاہدہ باقی ہے ان سے جنگ نہیں ہو سکتی۔ آیت میں 'دارالحرب' سے جس میثاق کا ذکر ہے اس کے ذیل میں علامہ زمخشری کہتے ہیں:۔

لا یجوز لکم نصرھم علیھم لانھم لا یبتدؤن بالقتال اذ المیثاق مانع من ذالك [۱]

دارالحرب کے مسلمان مدد طلب کریں تو تمہارے لئے دارالحرب کے خلاف مسلمانوں کی مدد جائز نہیں ہے کیونکہ ان سے جنگ شروع کرنے میں معاہدہ مانع ہے۔

بیضاوی کہتے ہیں۔

لا ینقض عھدھم لنصرھم علیھم [۲]

مسلمانوں کی مدد کی خاطر ان سے جو عہد و پیمان کیا گیا ہے وہ توڑا نہیں جائے گا۔

امام رانوی فرماتے ہیں۔

المعنی انہ لایجوز لکم نصرھم علیھم اذ المیثاق مانع من ذلك [۳]

(آیت کے اس فقرے کے) معنی یہ ہیں کہ تمہارے لئے دارالحرب کے خلاف وہاں کے مسلمانوں کی مدد جائز نہیں ہے، اس لئے کہ معاہدہ (امن) اس میں مانع ہے۔

---

۱ زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۲/۲۳۱

۲ بیضاوی، انوار التنزیل: ۱/۳۹۶

۳ رازی، التفسیر الکبیر جلد ۸ جزء ۱۶ ص ۱۶۷۔۱۶۸

تفسیر بغوی اور خازن میں ہے۔

فلاتنصروھم علیھم[1] مسلمانوں کی مدد نہ کرو ان کے خلاف (جن سے معاہدہ ہے)

موجودہ دور میں حالات بدل گئے ہیں۔اس کے باوجود اسلامی ریاست اگر کبھی ضرورت سمجھے تو غیر اسلامی ریاست سے معاہدہ کرسکتی ہے کہ اس کے ہاں مسلمانوں کو بنیادی حقوق حاصل ہوں گے اور ان کے ساتھ عدل و انصاف کے تقاضے پورے کئے جائیں گے۔اسی طرح اسے بین الاقوامی معاہدوں کی پابند بنانے کی بھی وہ کوشش کرسکتی ہے۔

اظہارِ دین اور جہاد

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے نازل کردہ دینِ حق کے متعلق ارشاد ہے کہ دنیا میں لازماً اس کا 'اظہار' ہو کر رہے گا اور مخالف طاقتیں اسے ناکام نہیں کرسکیں گی۔چنانچہ ارشاد ہے:

يُرِيْدُوْنَ أَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَابَى اللّٰهُ إِلَّا أَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِىْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

(التوبۃ:۳۲-۳۳)

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونھ سے بجھا دیں مگر اللہ اپنے نور کو مکمل کئے بغیر نہ مانے گا چاہے اسے کافر ناپسند ہی کریں۔اسی نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے، چاہے اسے مشرک ناپسند ہی کریں۔

---

[1] بغوی مع الخازن:۳/۶۹

یہ سورۂ توبہ کی آیات ہیں۔ یہی آیات تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورۂ صف (آیت: ۸-۹) میں بھی آئی ہیں اور دوسری آیت جس میں 'اظہار' کا ذکر ہے سورۂ فتح (آیت: ۲۸) میں بھی موجود ہے۔ سورۂ توبہ کی آیات اہلِ کتاب کی فتنہ سامانیوں کے ذیل میں آئی ہیں اور سورۂ صف اور سورۂ فتح میں مشرکین کی قوت آزمائی اور جنگی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ دونوں جگہ کہا گیا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین اپنی سازشوں اور معاندانہ کوششوں میں ناکام ہوں گے۔ وہ اللہ کے نور کو پھونک مار کر نہیں بجھا سکتے۔ وہ لازماً پھیل کر اور غالب ہو کر رہے گا۔

قرآن کے الفاظ ہیں 'لیظہرہٗ' تاکہ اس کا اظہار کرے، اس کے متعلق مفسرین میں سے بعض کا خیال ہے کہ اس کا تعلق رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے ہے اور بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ اس میں دینِ حق کے اظہار کا ذکر ہے، لیکن ان دونوں باتوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ اظہار چاہے آپ ﷺ کا ہو یا آپ کے لائے ہوئے دین کا، دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔

اب اس پر غور کیجئے کہ اظہار کے معنی کیا ہیں؟ بعض حضرات نے اسے صرف علمی و فکری اظہار اور بعض نے اسے خالص سیاسی نوعیت کا اظہار تصور کیا ہے۔ ان دونوں میں پوری صداقت نہیں، جزوی صداقت ہے۔ اس لئے کہ ان میں 'اظہار' کا صرف ایک پہلو بیان ہوا ہے اور دوسرا نظر انداز ہو گیا ہے۔ لغت میں اس کے دونوں معنی بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ لسان العرب میں اس مادّے کے استعمالات کا ذکر اس طرح ہے۔

ظهر علی الشئی غلبه وعلاه، ویقال ظهر فلان الجبل اذا علاه ۔۔ یقال اظهر الله المسلمین علی الکافرین اذا أعلاهم علیهم ۔۔۔ واظهرتُ	'ظہر علی الشیٔ' کے معنی ہیں اس چیز پر غالب آ گیا اور چڑھ گیا۔ 'ظہر فلان الجبل' اس وقت کہا جائے گا جب کہ آدمی پہاڑ پر چڑھ جائے۔ 'اظہر اللہ المسلمین علی الکافرین' اس وقت کہا جاتا ہے جب

الشیء بیّنتہُ، یقال اظھرنی اللہ علی ما سرق منی ای اطلعنی علیہ،[۱]

اللہ تعالیٰ کافروں پر مسلمانوں کو غلبہ عطا کردے۔اسی طرح 'اظھرت الشیئ' کے معنی ہیں میں نے وہ چیز بیان کردی۔کہا جاتا ہے 'اظھر نی اللہ علی ما سرق منّی' یعنی میری جو چیز چوری ہوئی تھی اللہ نے مجھے اس کی اطلاع دے دی۔

اس میں غلبے اور سربلندی کا تصور بھی ہے اور ظہور اور وضاحت کے معنی بھی ہیں۔

علامہ بغوی کہتے ہیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ آیت میں "لیظھرہ" کی ضمیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ ولم کی طرف راجع ہے۔اس کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو دین کے تمام احکام وقوانین کی اس طرح تعلیم دے گا کہ اس کا کوئی پہلو مخفی یا غیر واضح نہ رہے گا۔مزید فرماتے ہیں: بعض دوسروں نے کہا ہے کہ اس میں ضمیر دینِ حق کی طرف راجع ہے،اس کے تمام ادیان پر اظہار کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت صرف اسی (کی تعلیمات) کے مطابق ہو۔[۲]

امام شافعی نے اسے وضاحت ہی کے معنی میں لیا ہے۔فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اپنے دین کا اظہار کردیا۔یعنی اس کی اس طرح وضاحت فرمادی کہ جس نے بھی اسے سنا اس پر واضح ہوگیا کہ وہ حق ہے اور اس دین کے خلاف جو ادیان ہیں وہ باطل ہیں۔[۳]

---

۱ لسان العرب،۴/۵۲۶،۵۲۷،مادہ ظہر

۲ بغوی مع الخازن تفسیر:۳/۱۰۹،دارالکتب العلمیہ،لبنان ۱۹۹۵ء

۳ البحر المحیط:۵/۳۴

علامہ ابوبکر جصاص حنفی نے اس آیت کی تشریح میں ان دونوں پہلوؤں کو شامل کیا ہے۔ فرماتے ہیں: اس آیت میں نبی کریم ﷺ اور اہل ایمان کے لیے بشارت ہے کہ ان کی مدد ہوگی اور ان کا دین تمام ادیان پر غالب ہوگا۔ اظہار سے مراد ہے دلیل (کے ذریعہ) اور غلبہ واقتدار کے ذریعہ غالب ہونا اور آپ کی امت کا تمام قوموں کو زیر کر دینا۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنی آنکھوں سے وہ چیز دیکھ لی جس کی آپ کو خبر دی گئی تھی کہ آپ کی امت ان تمام قوموں پر غالب آ گئی جو دین اسلام کی مخالف تھیں۔[1]

امام رازی فرماتے ہیں کہ اظہار سے مراد یہاں دلائل کے ذریعہ غالب ہونا نہیں، بلکہ سیاسی غلبہ ہی مراد ہوسکتا ہے، اس لیے کہ اللہ کا دین دلائل کے ذریعہ ہمیشہ ہی غالب رہا ہے اور آیت میں مستقبل میں اس کے غالب ہونے کی خبر دی گئی ہے اور یہ سیاسی غلبہ ہے۔[2]

حقیقت یہ ہے کہ ان الفاظ میں یہ دونوں پہلو موجود ہیں۔ ان میں سے کسی کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ علامہ رشید رضا مصری ان دونوں معانی کے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

والإستعلاء هنا بالعلم والحجة أو السيادة والغلبة أو الشرف والمنزلة أوبها كلها و هو المختار و إن كان الوعد يصدق ببعضها۔[3]	یہاں غلبہ اور بلندی سے مراد ہے علم اور دلیل کا یا سرداری اور اقتدار کا یا شرف و عزت اور مرتبہ کا غلبہ، یا یہ کہا جائے کہ اس میں یہ تمام پہلو شامل ہیں، یہی رائے پسندیدہ اور قابلِ ترجیح ہے، گو کہ وعدہ ان میں سے بعض کی تصدیق کرتا ہے۔

---

[1] احکام القرآن: ۳/۱۳۵

[2] التفسیر الکبیر، ج ۸، جزء ۱۶، ص ۳۳

[3] تفسیر المنار: ۱۰/۳۸۹۔۳۹۰

حقیقت یہ ہے کہ کسی نظریہ کی علمی اور فکری برتری یا اس کا اقتدار پر پہنچنا اور اسے عزت و وقار اور اعتبار کا حاصل ہونا یہ سب غلبہ کی مختلف شکلیں ہیں۔ ان میں ایک طرح کا ربط و تعلق بھی ہے۔

اب اس بات پر غور کیجیے کہ رسول اللہ ﷺ یا آپ کے لائے ہوئے دینِ حق کا اظہار یا غلبہ کس طرح ہوا اور وہ کس طرح عالمِ وجود میں آیا؟

ایک رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کی امت کو متمدن دنیا کے بڑے حصہ پر عملاً غلبہ عطا فرمایا۔ اس طرح اللہ کا یہ اعلان پورا ہوا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس کا تعلق جزیرۃ العرب سے ہے۔ آپ کی زندگی ہی میں یہ وعدہ پورا ہو گیا۔[1] یہ دونوں ہی باتیں تاریخی لحاظ سے بالکل درست ہیں، اس سلسلے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ قیامت سے پہلے اس دین کا اور اس کے ماننے والوں کا اس طرح غلبہ ہوگا کہ تمام ادیان اس کے ماتحت ہو کر رہ جائیں گے۔[2]

اس رائے کی اہمیت اس پہلو سے ہے کہ دورِ آخر میں اس طرح کے غلبہ کی بشارت احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اب اس 'اظہار' کی کیا شکل ہوگی؟ کیا یہ کام دلائل اور براہین کے ذریعہ ہوگا یا بزورِ قوت تمام ادیان کو زیر کرنے اور ان پر غالب آنے کی کوشش ہوگی؟ اس کے جواب کے لیے رسول اکرم ﷺ کے اسوہ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ آپ کا اسوہ بتاتا ہے کہ آپ نے پہلے یہ ثابت کیا کہ اللہ کے دین کے حق ہونے پر ناقابل تردید دلائل موجود ہیں۔ ان کی تردید کسی بھی طرح نہیں کی جا سکتی۔ اس کے مخالفین بے دلیل اس سے لڑ رہے ہیں۔ آپ نے جنگ اس وقت کی جب کہ مخالفین کے پاس فوجی اور عسکری اور سیاسی قوت تو تھی لیکن دلیل کی قوت سے وہ تہی دامن تھے۔ اس طرح آپ نے دلیل کے میدان میں کامیاب ہونے کے بعد سیاسی میدان میں کامیابی حاصل کی تھی۔ یہی راستہ آج بھی ہے۔ اس کے بغیر یہ جنگ جیتی نہیں جا سکتی۔ ●●●

---

[1] علامہ قرطبی کہتے ہیں قیل اراد لیظہرہ علی الدین کلہ فی جزیرۃ العرب وقد فعل (قرطبی تفسیر جلد ۴ جزء ۸ ص ۷۸) قرطبی نے اس کے علاوہ کسی دوسری رائے کا ذکر نہیں کیا ہے۔

[2] ان تمام رایوں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ ابوحیان اندلسی، البحر المحیط: ۵/۳۴۹ تفسیر الخازن مع تفسیر البغوی: ۳/۱۰۹